قرآن کریم انسان کی ہر ضرورت کو پورا کرنے والا اور اُس کے درختِ وجود کی ہر شاخ کی پرورش کرنے والا ہے

(خطبہ جمعہ فرمودہ ۱۴؍ جولائی ۱۹۷۲ء بمقام سعید ہاؤس۔ ایبٹ آباد)

تشہّد وتعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور انور نے فرمایا:-

پچھلے خطبہ میں مَیں نے بتایا تھا کہ قرآن کریم بڑی عظمت اور شان کا مالک ہے۔ اس نے اپنی عظمت اور علوّشان کے متعلق خود دعویٰ بھی کیا ہے اور اس کے دلائل بھی دیئے ہیں۔

چنانچہ پچھلے خطبہ میں مَیں نے قرآن کریم کی اِس شان کو مختصراً بیان کیا تھا اور بتایا تھا کہ قرآن کریم انسان کی ناقص عقل کے اختلافات کو دور کرنے کا دعویٰ بھی کرتا ہے اور اس کے حق میں دلائل بھی دیتا ہے اور عقول ناقصہ کے اختلافات دُور کر دیتا ہے۔

آج قرآن کریم کی ایک اور عظمت ایک اور شان کے متعلق میں مختصراً کچھ کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آنخضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت تک انسان کی طرف جتنی بھی آسمانی ہدائیتیں نازل ہوئی ہیں ان میں سے ہر ایک میں ایک چیز نمایاں طور پر ہمیں نظر آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے پہلے کے تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیم انسان کی جُزوی ترقیات کے سامان پیدا کرتی تھیں۔ وہ انسان کی کامل ترقی کے سامان نہیں پیدا کرتی تھیں۔ اس لئے کہ انسان اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے ابھی اپنے ارتقاء کو، اپنے عروج کو نہیں پہنچا تھا۔ تاہم یہ بات ہم تسلیم کرتے ہیں کہ انسان اپنے ارتقائی ادوار میں جس مقام، جس وقت، جس زمانے اور جس ملک میں رہتا تھا اُس زمانے،

اُس ملک اور اُن حالات میں اُس کے مناسب حال جو بھی تعلیم تھی وہ اللہ تعالیٰ نے اُس قوم کی طرف اُس زمانے کے نبی کے ذریعہ نازل کی اور اس طرح انسان کی جزوی ترقی کے درجہ بدرجہ سامان پیدا کئے جاتے رہے تا کہ انسان جزوی ترقیات کے نتیجہ میں ارتقائی مدارج میں سے گذرتے ہوئے اپنی صلاحیتوں کے عروج کے لحاظ سے اس زمانے میں پہنچ جائے جس میں انسان کامل حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ہونے والی تھی۔

پس قرآن کریم سے پہلے کی جس قدر ہدایتیں اور شریعتیں ہیں وہ انسانوں کی حالت کے لحاظ سے اور اُن کی ضروریات کے لحاظ سے، اُن کی جزوی ترقی کے سامان پیدا کرتی چلی آ رہی تھیں۔ اس سے زیادہ وہ کچھ کر ہی نہیں سکتی تھیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے انسانی تاریخ کا مطالعہ اپنی ذات میں ایک بڑا لطیف مضمون ہے۔ اس سے ہمیں یہ پتہ لگتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام نے اللہ تعالیٰ سے ہدایت پا کر اپنے اپنے زمانہ میں انسان کی جزوی ترقی اور اس کے تدریجی ارتقاء میں پوری کوشش کی۔ تاہم یہ چیز بڑی نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے کسی نبی کی شریعت میں انسان کی کلّی ترقی کے سامان نہیں پائے جاتے تھے۔

غرض انبیاء علیہم السلام اور آسمانی شرائع کا سلسلہ تو اپنے عروج اور کمال اور افضلیت کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم ہو گیا لیکن فلسفیوں کا جو سلسلہ ہے وہ کسی پر ختم ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے کیونکہ اس سلسلہ کو کمال حاصل ہے نہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے جب ہم فلاسفروں اور مفکرین کے حالات کا مطالعہ کرتے اور ان کے نظریات پر نگاہ ڈالتے ہیں تو پتہ لگتا ہے کہ ان کی فکر اور تدبر کے نتیجہ میں (گو اس میں شک نہیں اُنہوں نے بعض اچھی باتیں بھی کہی ہیں مگر مجموعی لحاظ سے) انسان کو جو کچھ ملا ہے وہ محض جزوی بھلائی اور خیر تھی۔ اس میں ایک تو انسان کی کامل ترقیات کے سامان نہیں تھے۔ دوسرے یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی انسان کی کوئی ایسی آزادانہ فکر اور اس کے نتیجہ میں کوئی نظریہ قرآن کریم سے بہتر ہمیں نظر نہیں آتا۔

بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان فکر و تدبر نے کام تو ضرور کیا۔ بعض لوگ بڑے اچھے دل رکھنے والے تھے۔ ان کی طبیعت میں انسانیت کی خیر خواہی بھی پائی جاتی تھی۔ ہم یہ ساری باتیں تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود اُن کا دُنیوی فکر و تدبر اپنے کمال کو نہیں پہنچا تھا۔

انبیاء علیہم السلام کے سلسلہ پر جب ہم غور کرتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں جو چیز نمایاں ہوتی ہے اور جسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی کتب میں مختلف مثالیں دے کر واضح کیا ہے وہ یہ ہے کہ پہلی شریعتوں نے انسان کو جُزوی ترقی کے سامان دیئے تھے۔ کُلّی ترقی یا کامل ارتقاء کا سامان یعنی وہ علوم جن سے انسان اپنی صلاحیتوں کی نشوونما کو کمال تک پہنچا سکے وہ علوم صرف اسلام نے ہمیں سکھائے ہیں، پہلوں نے نہیں سکھائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بائیبل کی یہ مثال دی ہے کہ یہودیوں کی تاریخ کی ابتداء میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ تعلیم دی گئی تھی کہ اگر کوئی شخص تیرے گال پر تھپڑ لگاتا ہے تو اس کی گال پر ضرور تھپڑ لگے (خروج ۲۱:۲۵) معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور پھر یہودیوں کی تاریخ کے آخری دور میں کہا گیا۔ اگر کوئی آدمی تیرے ایک گال پر تھپڑ مارتا ہے تو تُو دوسرا گال بھی اُس کے سامنے کر دے (متی ۵:۳۹)۔ دراصل وہ بھی ایک جزوی حکم ہے اور یہ بھی ایک جُزوی حکم ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ اگر کوئی شخص تیرے منہ پر تھپڑ لگاتا ہے تو ایسے موقع پر تیرے ذہن میں دو چیزیں آنی چاہئیں۔ ایک یہ کہ اپنی صلاحیت کو دیکھو۔ خدا تعالیٰ نے تجھ پر احسان کیا ہے۔ تجھے اسلام کی تعلیم دی جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک انتہائی حسین اور ارفع نعمت ہے۔ اس عمدہ تعلیم کے ذریعہ تیری بریت کی گئی اور دوسرے یہ کہ تیرے بھائی کا درد تیرے دل میں پیدا کیا گیا۔ ان دو پہلوؤں کے لحاظ سے ایک چیز نمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہے اور وہ تیرا یہ ردّعمل کہ مَیں اپنے نفس اور اس کے جذبات کو قربان کرتے ہوئے معاف کرتا ہوں۔ اس قسم کا ردّعمل کہ خدا تعالیٰ کے لئے جذبات کو قربان کر دیا جائے۔ اسلامی تعلیم ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اگر بدلہ لینے کی صورت میں گال پر تھپڑ لگانے کی ضرورت ہے تو یہ کام اپنی نفسانی خواہشات یا حیوانی جذبہ کے ماتحت نہیں کرتا۔ اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ اگر کسی سے بدلہ لینے کی ضرورت ہے تو پھر تم نے اس طرح نہیں لڑنا۔ جس طرح بکریاں لڑتی ہیں یا شیر لڑتے ہیں یا مینڈھے لڑتے ہیں اور یہ اتنے زور سے ٹکر مارتے ہیں کہ انسان سمجھتا ہے کہ اگر وہ اتنے زور سے ٹکر مارے تو اس کی کھوپڑی کی ہڈی ٹوٹ جائے۔ پس جس طرح دوسری چیزوں

کی آپس میں لڑائی ہو رہی ہے۔ اس طرح تم نے دوسرے انسان سے بدلہ نہیں لینا لیکن اگر کوئی کہے کہ جس طرح دوسرے لوگ لڑتے ہیں اسی طرح مسلمان بھی لڑتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا یہ عمل اسلامی تعلیم پر عمل نہ کرنے کا نتیجہ ہے دوسرے ایسی صورت میں تو وہ حقیقی انسان بھی نہیں ہوتے مثلاً حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص چوری کرتا ہے وہ چوری کرنے کی حالت میں مسلمان نہیں رہتا۔ اسی طرح جو شخص بھیڑوں کی طرح ایک دوسرے سے لڑتا ہے، وہ اس وقت انسان کی حیثیت میں نہیں لڑ رہا ہوتا۔ وہ اس وقت گویا انسانی معیار سے نیچے گرا ہوا ہوتا ہے۔

پس ایسی صورت میں ہر سچے مسلمان کے سامنے ایک تو یہ چیز آتی ہے کہ اسے اپنے جذبات کو خدا اور اس کی رضا کے حصول کے لئے قربان کر دینا چاہئے۔ اور دوسرے یہ کہ اس کا اصل مقصود اس کے بھائی کی اصلاح کرنا ہے یعنی اگر کسی کو معاف کر دینے میں اس کی اصلاح ہوتی ہے تو معاف کر دو۔ اگر بدلہ لینے میں اس کی اصلاح ہوتی ہے تو بدلہ لو مگر ان ہر دو پہلوؤں کے متعلق انسان کو اپنی سمجھ اور ذہنی قابلیت کے مطابق ہی فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ جہاں تک سمجھ اور قابلیت کا تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ (البقرۃ:۲۸۷)

جو چیز انسان کی سمجھ سے بالا ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کا مکلّف نہیں ٹھہرایا غرض انسان اگر یہ سمجھے کہ میں بدلہ لوں تو دوسرے کی اصلاح ہوتی ہے تو پھر بھی غصہ کی حالت میں نہیں بلکہ اصلاح کی غرض سے بدلہ لینا ہے لیکن اگر وہ یہ سمجھے کہ مَیں معاف کر دوں تو شاید اس کی اصلاح ہو جائے گی۔ اس کے اندر شرمندگی کے جذبات پیدا ہو جائیں گے کیونکہ انسانی طبیعت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ندامت محسوس کرتی ہے تو پھر وہ اس کو معاف کر دے۔ چنانچہ مسلمان عموماً معاف کر دیتا ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جب وہ کسی سے بدلہ لیتا ہے تو وہ اپنی خواہش نفس کے طور پر نہیں لے رہا ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق لے رہا ہوتا ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کسی وقت بھی معاف نہ کرتا۔

بہرحال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق لوگوں کی

ایک مخصوص صلاحیت کی پرورش اور اس کی نشوونما کے لئے بدلہ لینے کی تعلیم دی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق ایک دوسری صلاحیت کی پرورش اور نشوونما کے لئے صرف معاف کر دینے کی تعلیم پر زور دیا۔

اسی طرح برصغیر پاک و ہند کی پرانی تاریخ کو لے لیں۔ برصغیر میں جو انبیاء آئے ہیں اُن میں سے ایک حضرت گوتم بدھ ہیں دھیمی طبیعت والے اور دوسری طرف وہ ہیں جو اگر وید کی آواز کان میں پڑ جائے تو سیسہ پگھلا کر کانوں میں ڈالنے والے ہیں۔ یہ ہدائتیں اپنے زمانہ میں انسان کی اصلاح کرنے کے لئے آئی تھیں مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بگڑ کر بھیانک شکلیں اختیار کر گئیں۔ لیکن جس طرح پھول بگڑتا ہے تو وہ گاجر نہیں بنا کرتا اور جب گاجر بگڑتی ہے تو وہ گلاب کے پھول کی شکل اختیار نہیں کرتی اسی طرح ان کی بگڑی ہوئی شکل بگڑے ہوئے ہونے کے باوجود اپنی اصلی ہیئت کذائی کی طرف اشارہ کر رہی ہوتی ہے ورنہ حضرت گوتم بدھ کی تعلیم جو ہے وہ بگڑ کر سیسہ پگھلا کر ڈالنے والی بن جاتی۔ حضرت گوتم بدھ نے نرمی پر زور دیا تھا وہ نرمی کی طرف بگڑی دوسری طرف سختی پر زور دیا گیا تھا وہ جب بگڑی تو سختی کی طرف بگڑی۔

بہرحال انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ انسان کی صلاحیتوں کی جزوی نشوونما کے سامان پیدا کئے گئے مثلاً ایک بلند مینار ہے اس کے اوپر چڑھنے کیلئے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں ہر سیڑھی کو اگر ہم ایک زمانہ سمجھ لیں تو انسان گویا اُس زمانے میں خدا تعالیٰ کے نبی کی انگلی پکڑ کر ایک سیڑھی چڑھ گیا۔ پھر ایک اور نبی آیا اُس نے انسان کو اگلی سیڑھی چڑھا دی اور اس طرح اُس بلند مینار پر چڑھنے کے لئے جزوی طور پر مدد کی گئی لیکن اس مینار کے اوپر تک پہنچنے کے سامان نہیں پیدا کئے گئے۔

جہاں تک فلسفے کا تعلق ہے میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ اس سلسلہ میں انسانی فکر و تدبر کے نتیجہ میں نئی سے نئی فلسفیانہ بحثیں بڑی نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آ رہی ہیں۔ خاص طور پر اقتصادی اور معاشرتی تعلقات کے بارے میں نئے سے نیا فلسفہ سامنے آ رہا ہے۔ مذہبی لحاظ سے بھی مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہود سے کہا تھا کہ دیکھنا کسی یہودی سے سُود نہ لینا اس

حکم کے اندر اقتصادی اور معاشرتی دونوں پہلو پائے جاتے ہیں لیکن اسلام کا یہ کمال ہے کہ اس نے کہا کسی سے بھی سُود نہیں لینا۔

پس آج کا جو معاشرہ ہے اس کی تفصیل میں تو اس وقت جانے کا وقت نہیں لیکن اتنی بات تو ہر کوئی جانتا ہے کہ بین الاقوامی سطح پر اس وقت اقتصادی اور معاشرتی تعلقات کے لحاظ سے جو سرمایہ دارانہ نظام ہے اس کا اشتراکی نظام سے بڑا زبردست CLASH (کلیش) ہے۔ اس ٹکراؤ کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے بہرحال خیرخواہ نہیں ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ہلاکت سے بچانے کے لئے اگر دوستی کا ہاتھ بڑھائیں تو یہ خیرخواہی نہیں اور چیز ہے۔

میں نے پہلے بھی کئی دفعہ بتایا ہے۔ میں جب ۱۹۷۰ء میں افریقہ کے دورے پر گیا تھا تو فرینکفورٹ سے لیگوس تک چھ گھنٹے دس منٹ کی بڑی لمبی فلائیٹ تھی۔ ہماری پچھلی سیٹ پر دو بوڑھے امریکن بیٹھے ہوئے تھے ان کے ساتھ تعارف ہوا۔ پھر باتیں شروع ہوگئیں۔ باتوں باتوں میں مَیں نے اُن سے کہا کہ یہ سوچ کر انسان حیران ہوتا ہے کہ انسان انسان سے پیار کرنا کب سیکھے گا چونکہ وہ پڑھے لکھے اور سمجھ دار لوگ ہیں فوراً سمجھ گئے کہ اس نے ہم پر سخت طعن کیا ہے۔ چنانچہ ان میں سے ایک کہنے لگا اب تو ہمارے تعلقات روس سے اچھے ہو رہے ہیں۔ میں نے کہا۔ OUT OF FEAR, NOT OUT OF LOVE۔ خوف کی وجہ سے تمہارے تعلقات اچھے ہو رہے ہیں پیار کی وجہ سے تو تمہارے تعلقات اچھے نہیں ہو رہے۔ وہ بے اختیار کہنے لگا کہ یہ بات آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ تاہم یہ تسلیم کرلیں کہ ایک قدم صحیح جہت کی طرف اُٹھایا گیا ہے میں نے کہا ہاں! مَیں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ایک قدم صحیح جہت کی طرف اُٹھایا گیا ہے لیکن ایک ہی قدم اُٹھایا گیا ہے یعنی میری وہی بات آ گئی کہ یہ ایک جزوی حرکت ہے کلّی حرکت نہیں ہے۔

پھر اسی طرح آج کا جو فلاسفر ہے وہ مختلف گروہوں میں بٹ گیا ہے اور اپنے اپنے حالات کے مطابق اُنہوں نے اپنے ساتھ تعلق رکھنے والے انسانی گروہ کی جزوی ترقیات پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن کلی ترقیات کے سامان پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے جہاں اور بہت ساری صلاحیتیں دی ہیں وہاں روحانی طور پر بھی استعدادیں بخشی ہیں۔ اب

نہ سرمایہ دارانہ نظام انسان کی روحانی استعدادوں، روحانی قدروں اور روحانی صلاحیتوں کی نشوونما کی طرف متوجہ نظر آتا ہے اور نہ اشترا کی نظام اس طرف متوجہ نظر آتا ہے۔

پھر روس نے تو اخلاقیات کو بھی بالکل چھوڑ دیا تھا۔ان کے نزدیک اخلاقی طاقتیں گویا موجود ہی نہیں۔ اُنہوں نے اخلاقی طاقتوں کو پہچانا ہی نہیں تو پھر ان کے متعلق اُنہوں نے کوشش کیا کرنی تھی۔ چین نے اخلاقیات کو بھی اپنی زندگی کا حصہ بنایا ہے لیکن روحانی استعدادوں کو اُنہوں نے بھی بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔غرض روس اور چین یہ بات کھلم کھلا کہتے ہیں کہ روحانی استعدادوں کا تو وجود ہے ہی نہیں لیکن حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک انسانوں میں سے لاکھوں بزرگوں اور مقربین الٰہی کا یہ مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ اللہ ہے اور روحانی اقدار ہیں اور ان کو اپنی اپنی استعداد کے مطابق بڑھانا چاہئے۔

غرض یہ ایک مختصر تاریخی پس منظر ہے قرآن کریم کی عظمت اور نشان کو سمجھنے کے لئے انبیاء علیہم السلام کے سلسلہ کو لیں۔ ہر نبی کی تعلیم انسان کی جزوی ترقیات کے سامان پیدا کر رہی ہے اور انسان کو درجہ بدرجہ اعلیٰ مقام کی طرف لے جا رہی ہے چنانچہ ایک کے بعد دوسرا نبی آیا اور اُس نے انسان کے لئے جزوی ترقیات کے سامان فراہم کئے۔ کہتے ہیں ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی دُنیا کی طرف مبعوث ہوئے تو ہم کہتے ہیں کہ ٹھیک کیا ہے وہ ایک لاکھ چوبیس ہزار سیڑھیاں چڑھا کر انسان کو بلند ترین مینار کی اس چوٹی پر لے گئے جو انسانِ کامل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقام ہے۔

موجودہ زمانہ کے فلاسفر اور تھنکر زیعنی حقائق اشیاء کے متعلق غور اور تدبر کرنے والے لوگوں میں کچھ خوبیاں بھی نظر آتی ہیں۔ آخر وہ بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔کلّی طور پر عیب تو ان کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا گو ان کے اندازِ فکر میں برائی زیادہ ہے،کم عقلی زیادہ ہے۔ اُن میں فراست کی کمی ہے لیکن کچھ اُن میں اچھی باتیں بھی ہیں البتہ اُن کی جو اچھی چیزیں ہیں۔ وہ انسان کی ساری ضرورت کو مکمل طور پر پورا نہیں کر سکیں۔ انسان کی ساری ضرورتوں کو پورا کرنے کا دعویٰ صرف قرآن کریم کرتا ہے۔

وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا (بنی اسرائیل:۱۳)

اس آیۂ کریمہ کے اس ٹکڑے کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ اس کے ایک معنے یہ ہیں کہ قرآن کریم کی ہدایت اور شریعت اور تعلیم انسان کی جزوی ترقی کے لئے نہیں آئی بلکہ کلی ترقی کے لئے آئی ہے چنانچہ ایک اور جگہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے اسلام انسان کے درخت وجود کی ہر شاخ کی پرورش کرنے والا ہے۔ انسان کے درخت وجود کی جس قدر ہمہ گیر ترقی ہوسکتی تھی یعنی اس کی ہر شاخ خوبصورت ہو اس کے لئے قرآن کریم میں مکمل تعلیم موجود ہے ہم اس حسین تعلیم پر عمل نہ کریں تو اس کے ہم ذمہ دار ہیں۔ اس کا الزام ہم پر آئے گا۔ اسلام کی تعلیم پر اس کا الزام نہیں آئے گا لیکن سوال یہ ہے۔ ہم کیوں اس پر عمل نہ کریں ہمارے سامنے اچھی گرم گرم روٹی آئے تو اپنی عادت سے بھی زیادہ کھا جاتے ہیں ایک وقتی لذت کے لئے اپنا پیٹ خراب کر لیتے ہیں۔ کسی آدمی کو کوئی چیز پسند ہے، کسی کو کوئی چیز پسند ہے۔ جن لوگوں کو آم پسند ہیں کھانا کھا چکنے کے بعد اگر ان کے پاس آم آجائیں تو وہ سارے کھا جائیں گے۔ کسی آدمی کو انگور پسند ہیں تو وہ بے تحاشہ انگور کھا جائے گا۔

غالباً ہمارے بابر بادشاہ کا واقعہ ہے ایک دفعہ قندھار کی طرف سے اونٹوں پر بڑے موٹے موٹے آڑوؤں کے ٹوکرے آئے جن کی تعداد شاید ۱۶۵ تھی (پہلے تو صوبہ سرحد میں بھی بڑے موٹے موٹے آڑو ہوا کرتے تھے) بابر آخر بادشاہ تھے۔ اُنہوں نے دُنیا کو بھی کھلانا ہوتا تھا اور پھر ان کی فطرت پر اسلام کا بھی اثر تھا۔ اُنہوں نے ہر ایک ٹوکرے میں سے ایک ایک آڑو نکال کر کھا لیا اور اس طرح ایک اندازہ کے مطابق اُنہوں نے قریباً ۲۴ سیر آڑو کھائے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ کس قسم کے آڑو میری طرف بھیجے گئے ہیں پس کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس کو آڑو پسند ہیں وہ بے تحاشہ آڑو کھا جاتا ہے جس کو آم پسند ہیں وہ آم کھا جاتا ہے اور جس کو گرم گرم مزے دار روٹی مل جائے وہ بہت ساری روکھی روٹی کھا جاتا ہے۔ مگر اسلامی تعلیم جو کامل لذت اور کامل افادہ کا ذریعہ ہے اُسے لوگ ساری کی ساری کیوں نہیں لیتے؟ جب ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی آدمی اپنے شوق میں آم کھا گیا یا آڑو کھا گیا یا گرم گرم روٹی کھا گیا تو اس سے ہمیں یہ سبق بھی ملتا ہے کہ اسلام اور اس کی تعلیمات کو بھی پورے کا پورا لے لینا چاہئے کیونکہ اس سے اچھی اور لذیز چیز

اور کوئی نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ سے پیار کرنے کا ذریعہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے پیار سے زیادہ لذت والی چیز تو کوئی اور نہیں۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس بات کو بڑی کثرت سے بیان فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ قرآن کریم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا پیار ملتا ہے اور یہ ہمارا ذاتی مشاہدہ ہے اس لئے قرآن کریم پر ہم کیوں عمل نہ کریں۔

پس قرآن کریم کا دعویٰ یہ ہے اور ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ یہ انسان کے درختِ وجود کی ہر شاخ کی پرورش کرنے والا ہے۔ یہ انسان کی جزوی ترقی کے لئے نازل نہیں ہوا بلکہ اس کی کلی ترقی کے لئے نازل ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جتنی بھی استعدادیں، قوتیں اور صلاحتیں دی ہیں، ان کی کامل پرورش کے لئے قرآن کریم میں مکمل تعلیم موجود ہے۔ اس واسطے یہ ایک عظیم کتاب ہے۔ ہر احمدی بچے، جوان، بوڑھے اور ہر احمدی مرد اور عورت کو چاہئے کہ وہ اس عظیم کتاب پر غور کیا کرے۔ تمام احمدی اس پر غور کریں اور غور کریں اور اس میں سے اپنی جسمانی، ذہنی، اخلاقی اور روحانی لذتوں کے سامان تلاش کریں کیونکہ حقیقت یہی ہے اور اسی کی طرف آج ہمیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ پکڑ کر (سختی کے ساتھ جھنجھوڑ کر) لایا گیا ہے۔ فرمایا اَلْخَیْرُ کُلُّهٗ فِی الْقُرْاٰنِ (تذکرہ ایڈیشن چہارم صفحہ ۷۸) ہر قسم کی بھلائی قرآن کریم میں ہے اس پر غور کرو اور ہر اچھی بات اس میں سے تلاش کرو۔ پس قرآن کریم بڑی عظمت والی اور بڑی بلند شان والی کتاب ہے۔ اب اس کے متعلق آج میرا یہ دوسرا خطبہ ہے۔ میرے پہلے خطبہ کا عنوان تھا

۱۔ وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴿۳۱﴾

(الفرقان: ۳۱)

۲۔ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْا فِیْهِ

(النحل: ۶۵)

اس قسم کی عظیم کتاب سے انقطاع لسانی یا انقطاع قلبی نہیں ہوسکتا۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو یہ اس کی حماقت کی انتہا ہوگی جس طرح اسلام حسن واحسان کی انتہا ہے اسی طرح قرآن کریم کو چھوڑنا انسانی فعل کے لحاظ سے یعنی قرآن کریم کو چھوڑنے کے لحاظ سے حماقت کی انتہا ہے۔

حماقت تو تھوڑی بھی نہیں کرنی چاہیئے چہ جائیکہ حماقت کی انتہا کر دی جائے۔ پس اس قسم کا سوال ہی پیدا نہیں ہونا چاہیئے۔

غرض قرآن کریم سے کما حقہ مستفید ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرنی چاہئیں اوراس پر غور کرتے رہنا چاہیئے اوراس کو حرز جان بنالینا چاہیئے۔اس کو اپنی روح سمجھنا چاہیئے تمام توہمات کو دور کر کے اس کو اپنے سینے سے لگائے رکھنا چاہیئے۔

میں نے پہلے بھی کئی دفعہ بتایا ہے۔بعض مسلمان یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم کو اپنے ساتھ نہ رکھو شاید تم سو جاؤ اوراس کی طرف تمہاری پیٹھ ہو جائے۔کیا عجیب خیال ہے۔جب تم جاگ رہے ہوتے ہو تو تم نے اسے اپنی پیٹھ پیچھے پھینک دیا ہوتا ہے اس کی تعلیم کو قبول نہیں کرتے۔ لیکن جب تم سوئے ہوئے ہوتے ہو اور خدتعالیٰ کی گرفت کے نیچے نہیں ہوتے اس وقت تمہیں یہ فکر ہوتی ہے کہ قرآن کی طرف پیٹھ نہ ہو جائے۔ یہ خیال تو درست نہیں۔

بہرحال اس وقت تو میرے بھائی اور بہنیں، میرے عزیز بچے اور میرے بزرگان میرے مخاطب ہیں میں آپ سب سے یہ کہوں گا کہ قرآن کریم ایک عظیم کتاب ہے یہ بڑی عظمتوں والی کتاب ہے۔اس کتاب کی برکت اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کا فیض تھا کہ جس نے اُس گمنام شخص کو جو ایک گمنام بستی میں پیدا ہوا تھا اور جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے انتہائی پیار کیا تھا اس کو اس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روحانی فیض اور قرآن کریم کی برکت نے ساری دُنیا میں معروف ومشہور کر دیا۔ چنانچہ پانچ پانچ ہزار میل دور لاکھوں کی تعداد میں لوگ ہیں جن کے دل میں مہدی معہود علیہ السلام کا پیار سمندر کی لہروں کی طرح اُٹھ رہا ہے۔اس لئے کہ مہدی معہود اور مسیح موعودؑ جو ایک امتی نبی کی حیثیت سے ہماری طرف آئے تھے ان کی بدولت ہم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حسین چہرہ دیکھا اور اُنہوں نے ہمیں پکڑ کر کہا ہے کہ قرآن کریم کی طرف منہ کرلو گے تو ساری بھلائیاں تمہارے نصیب اور مقدر میں آجائیں گی۔اللہ تعالیٰ کا پیار تمہیں حاصل ہو جائے گا اوراس طرح ساری لذتیں اور سرور تمہیں مل جائے گا۔اس دُنیا میں بھی اور اُخروی زندگی میں بھی۔

(روزنامہ الفضل ربوہ ۲۵؍اگست ۱۹۷۲ء صفحہ ۲ تا ۴)